بانی: برکت علی چودھری

1935ء سے باقاعدگی سے شائع ہونے والا ادبی جریدہ

ماہنامہ ادبِ لطیف لاہور

جلد:82۔ شمارہ:5۔ مئی 2017ء

مُدیران

ناصِر زیدی

صدیقہ بیگم

دادی اماں کے نام

نیّر آغا

میری پیاری دادی اماں ۔ السّلامُ علیکم ورحمت اللہ و برکاۃ،

اللہ تعالیٰ آپ کو کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے۔ مقرّر بعد سلام عرض ہے پچھلے تیس برس سے خط نہ لکھنے کی معافی چاہتی ہوں۔ اس کوتاہی کی وجہ مواصلات کا غیر تسلّی بخش سِلسلہ تھا۔ یعنی جب کوئی رضائے الٰہی سے اچانک آپ کی دنیا میں روانہ ہوا تو بروقت ان سے آپ کو سلامِ محبت پُر از ہیبت ارسال کرنے کی مہلت نہ ملی۔ بہر حال آپ کی یاد سے کبھی غافل نہ رہی۔ اور آپ کے جنّت سدھارنے کے بعد مجھے یقین ہے کہ آپ کی دھماکہ خیز شخصیت نے وہاں تہلکہ مچا دیا ہوگیا کہ یزدان نے ایسے فہم و دماغ کے انسان ارسال کرنے شروع کر دیئے کہ آن کی آن میں میں فاصلے فاصلے نہ رہے بلکہ برسوں کے سفر مہینوں اور مہینوں کے دنوں میں طے ہونے لگے۔ اور دادی اماں اب تو پلک جھپکنے کی دیر ہے، گھنٹوں کے فاصلے بھی ختم ہوئے۔ بس کیا بتاؤں ، جب آپ کے زیرِ اثر گزرے ہوئے زندگی کے دِن یاد آتے ہیں تو:

اکثر شبِ تنہائی میں کچھ دیر پہلے نیند سے

یہ تو خیر محض ایک مصرع ہے۔ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ کیونکہ دادی اماں آپ اپنے اکلوتے بیٹے، بلکہ واحد اولاد کے سب بچوں میں زیادہ مجھے چاہتی تھیں کیونکہ بقول آپ کے کیا۔ سب کے ہی۔ میں آپ کی ہمشکل ہوں۔ آپکی چاہت چاہے بغض بے جا ہی سہی۔ کیونکہ والدہ مرحومہ کو آپکی تہلکہ خیز شخصیّت کی وجہ سے میری صورت سے سے لاشعوری وحشت ہوتی تھی۔ بہر حال یہ تو بعد کی یاد دلانے کی باتیں ہیں۔ ویسے اپنی صورت سے مشابہت کے صلے میں آپ میرا بے حد لاڈ اُٹھاتی تھیں۔ کبھی اُبلے ہوئے انڈے۔ زعفران و بادام کا حلوہ۔ چوزے اور پالک

کالذیذ سالن۔اور ایک نہایت زوردار قسم کا زردہ جو کہ آپ کی speciality ہوتی تھی اور جس کے چند لقمے کھا کر والدہ مرحومہ کو روز (migraine) دردِ سر ہو جاتا تھا۔ میں بے دھڑک آپ کی ڈولی میں یا نعمت خانہ کہیے، جا کر کھاتی تھی۔ بالائی اور بادام پستہ و کشمش تو گویا چنوں کی طرح آپ نچھاور کرتی تھیں۔ یہ سب اپنی جگہ نارمل تھا۔لیکن یہ سب التفات ایک خاص مقصد کے تحت اس ناچیز پہ ہوتے تھے۔

والدہ اکثر مجھے سمجھاتی تھیں کہ بیٹی لڑکیوں کو ایسی مُرغّن غذائیں راس نہیں آتیں۔قد لمبا نہیں ہوگا۔جسم بھدّا ہو جائے گا۔جِلد پر مہاسے نکل آئیں گے۔لیکن واہ رے لڑکپن کہ بچپن ہی سے بیوقوفی جو اکثر بچوں پہ طاری رہتی ہے۔ ہمیشہ غالب رہی،سُوپ کھیرے کے سینڈوچ۔ براؤن سٹو وغیرہ بھی کھاتی۔اور دادی اماں کے ہاں کا آتش فشاں diet بھی نوشِ جان ہوتا۔وزن تھا کہ اماں کی ایک دو ملنے والیوں نے مشورہ دیا کہ بچی کو تھائی رائیڈ گلینڈ thyroid gland کی سستی ہے۔اب یہ کون جانے کہ دادی اماں پیار اور لاڈ سے اور زیادہ تر اماں کو ستانے کیلئے میری خوراک کا خاص خیال رکھتی تھیں۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔آپکو قصہ اِس دنیا کا سنانا تھا۔اماں بھی آپکے پیچھے بوریا بستر باندھ کر سدھاریں۔دادا جان بھی۔اور والد مرحوم تو آپکی زندگی کا ایک ایسا المیہ تھے کہ اب خیال آتا ہے کہ دادی آپ نے زندگی کے آخری برسوں میں کتنا بڑا غم اُٹھایا۔بہر حال اب جبکہ آپ چاروں۔ یعنی قبلہ دادا۔ والد۔ والدہ اور آپ مغفور پھر سے ایک جگہ ہو گئے ہیں۔امید ہے ہمارے پہنچتے تک آپ حضرات نے ایک خوش گوار جنّت در جنّت اپنے لئے پیدا کر لی ہوگی۔آپکی بڑی بہو۔شاید اماں جی اور ممی (میری والدہ) نے آپس میں اتفاق کر کے آپ کو زیادہ غل مچانے سے روک رکھا ہے۔

تو دادی امّاں کیا کہنے آجکل کے۔جوں جوں آپ کو یہاں کے حالات معلوم ہونگے جلال آجائے گا۔ بلکہ مجھے ڈر ہے، کہیں وہاں بھی آپ اپنی بہو کو ذمّہ دار نہ ٹھہرائیں کہ ہائیں یہ ہمارے پیچھے اتنا کچھ ہو گیا اور کچھ روک ٹوک نہیں۔تو سُنئے دادی یہ پہلا نامۂ محبت ہے۔ بشرطیکہ میں آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو گئی تو۔دریں اثنا جس قدر واقعات ہو سکے اور دنیا میں جو ہو رہا

ہے۔ کم از کم آپ کی دنیا میں۔ آپکو آگاہ کرتی رہوں گی۔ ورنہ مجبوری ہے کیوں کہ جب اس دنیا سے کوچ کیا تو آپ کے نیاز حاصل کرنے شاید اس گناہ گار کے نصیب نہ ہوں۔ کیونکہ آپ نے تو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ جس روش پر ہم چلتے ہیں۔ اس سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ فردوسِ بریں کے کوسوں دور بھی ڈیرے ڈالنے کی اجازت ملے۔

اپنی ماں کی میں پہلی لڑکی تھی۔ میرا نام اُنہوں نے بہت سوچ بچار کے بعد رکھا۔ اُس زمانے میں تو سننے میں بھی نہیں آتا تھا۔ اب فلیٹ کریپ کی طرح عام ہو گیا ہے۔ اب ساس بہو کے خوشگوار تعلق کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ نے ایک جدا نام میرا رکھا جس میں والدہ بالکل نقص نہیں نکال سکتی تھیں۔ کیونکہ آپ نے ساتھ ایک شُرشُری لگا دی تھی کہ نام ایک خواب کی تعبیر پہ رکھا گیا ہے۔ بہرحال پیدائشی نام نیّر والدہ کا رکھا ہوا۔ اور رابعہ آپ کا۔ کیا مجال کہ والد قبلہ جو کہ علی گڑھ اور کیمبرج پلٹ تھے۔ اور والدہ کوئین میری کی تعلیم یافتہ۔ آپکی آواز سنتے ہی پیروں تلے زمین نکلتی نہ پا سکتے تھے۔

تو دادی کچھ لباس کے بارے میں سُنیئے۔ یاد ہے آپ کی اکیس گز کی شلوار جو کناویز کے پورے تھان سے بنتی تھی اور جسکی انگنت چُنٹیں سمیٹنے کو رستے برابر موٹا کمر بند ہوتا؟ اماں کی ساڑھے چار گز کی شلوار پہ آپکو شدید ملال ہوتا۔ اور آپ ایسے وقت بات داغ دیتیں کہ قیامت ہے۔ ہمارے بیٹے کی عزت میں کتنا فرق پڑتا ہے۔ جبکہ دادا ابا بھی سامعین میں سے ہوں۔ ابا تو خیر آپکی ہر بات نہایت سعادت مندی اور عزت واحترام سے سُن کر بالکل فراموش کر دیتے۔

آپ کی چھینٹ کی شلوار بھی ۱۴ گز کی ہوتی۔ کیونکہ چھینٹ کا ارض گز بھر اور کناویز ۱۴ گرہ ارض۔ کناویز بھی آپکی یارقند کے کاروان والوں کی لائی ہوئی ہونی چاہیے تھی۔ اور لحافوں کا گل برّہ بھی ویسا ہی روس وچین کا آیا ہو۔ چھینٹ آپ فرنگیوں کی پسند فرماتیں۔ قمیض آپکی ۵ گز کی ہوتی۔ دائیں بائیں ایک ایک لیٹی ما پلیٹ سے کچھ وضع دی جاتی۔ والدہ غریب کی پونے تین گز قمیض آپکے نزدیک محض ایک بہانہ تھا بلکہ کمر میں پڑے ہوئے ڈاٹ تو آپ کیلئے نہایت ہی آزاد خیالی کی علامت تھی۔

جب آپ کی شلوار ڈھل کر ریسمان پہ ٹانگی جاتی تو تقریباً ۲۰ گز تو پھیلاؤ ہوتا ہوگا۔ اللہ

جانے استری کرواتی تھیں یا نہیں۔ کیونکہ گھر میں لوہے کی استری کو نہایت معیوب ودنی قرار دیا تھا آپ نے۔ کہ کیوں جہنم کے انگارے لباس پر پھیرے جائیں۔ بلکہ غریب مالازم کھینچا تانی کر کے کھینچ کرآپکے کپڑوں کی تہ جماتی۔ ویسے جب دھوبی والدہ کے کپڑے یا ساڑھیاں استری کر کے لاتا تو آپ فوراً اپنی حویلی سے دو چار چھوٹے چھوٹے قسم کے کپڑے بھی ارسال کر دیتیں اور تخت پوش پر بیٹھ کر نوٹ کرتیں کہ دھوبی کتنی دیر کے بعد آپکے ملبوسات کو سنوارتا ہے۔ خود مختار آپ بہت تھیں۔ ایک ہی باغ میں ابا کی کوٹھی اور دوسرے سرے پر یعنی روبرو آپکی حویلی تھی۔ کوئی آمد و رفت آپ کی نگاہِ شاہین کی security سے بچ کر نہیں جا سکتے تھے۔ پھر آپ کا برقع، وہ اس زمانے کی بہت معتبر چیز تھی۔ پورے تھان کا سفید برقع۔ براق جیسا۔ جس کی ٹوپی پر کڑھائی کرنے والا ضرور بینائی کھو بیٹھا ہوگا۔ دوسرا برقع کابلی ریشم کا۔ فاختائی رنگ کا۔ جسکی مثال نہیں ملتی۔

تو سنو دادی۔ اب جبکہ میں خط لکھ رہی ہوں شلوار کا رواج ہی نہیں ہے۔ بلکہ چند برس تک میں وہ آثارِ قدیمہ کو عجائب گھر میں رکھنے کے لئے دے دوں گی۔ اسلامی مملکتِ پاکستان ہے۔ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی رواج پھر سے ہو جاتا ہے۔ اب آپ یہ سمجھ کر اماں اور ابا سے تنازع نہ شروع کر دینا کہ ہم نے بالکل ہی شلوار کو خیر آباد کہہ دیا ہے بلکہ چار گز سے تین گز۔ پھر ڈھائی گز۔ دو گز اور ڈیڑھ گز میں بھی ہنسی خوشی شلوار بن جاتی ہے۔ اسکو گنڈی کٹ کہتے ہیں۔ اور پائنچے برجس کی طرح فٹ ہوتے ہیں۔ بلکہ پاؤں ٹھونسنے کی خاطر ایک دو بٹن کندوں پر لگانے پڑتے ہیں۔ آپ کو تو یاد ہوگا، آپ مجھے پٹولوں میں گڑیا کیلئے بھی بڑا ہی کپڑا دیتی تھیں۔ اور گنڈی کٹ تو شائد آپ کے دشمنوں نے بھی نہ سنا ہو۔ کہاں آپکے گزوں لمبے گھیر جنکی تہوں میں پرانا ہونے کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ اب بیل باٹم۔ PIA کٹ۔ اور کچھ عرصے سے ایک نئی شلوار دیکھنے میں آتی ہے جسکے پائنچے تھیلوں کی طرح ہیں اور خاک دھول سمیٹتے سڑکوں پہ گھسٹتے پھرتے ہیں۔ نہ پائنچہ۔ نہ کندہ کی تراش۔ بس خدا جھوٹ نہ بلوائے تو گز بھر کا چوڑا تھیلا جس میں آسانی سے تین ٹانگیں سما جائیں۔ یہ وقتی بات ہے۔ کچھ عرصے بعد ہم بھی فرنگیوں کی طرح اپنی کالی کالی ٹانگوں کو دوڑاتے پھریں گے۔ اکثر فرنگی ہمارے لباس کو بہترین قرار دیتے ہیں سہولت۔ آرام اور

پہننے کی غرض سے۔ لیکن دادی آپ نے سنا ہے۔ بلکہ آپ سے میں نے سنا تھا۔ اپنی عقل اور دوسرے کی دولت ہمیشہ اچھی لگتی ہے۔ اس لیے فرنگیوں کی بات پر کیا جانا۔

اور دادی دوپٹہ کی سر سے ضرورت ہی نہیں۔ بلکہ ایک پٹہ بھی بیکار ہے۔ اگر بہت طبعیت مچلے تو ڈیڑھ گز کی شیفون کورتی کی طرح بٹ کر گلے میں ڈال دیا۔ کہاں وہ چھبی دیاں چنیاں ۔ یا جالی کے کڑھے ہوئے دوپٹے۔ جلدی میں ناک کھجانی ہو یا ہونٹ پونچھنے ہوں تو کچھ ہاتھ میں نہیں آتا۔ باورچی خانے میں جلتی ہوئی ہنڈیا اتارنی ہو تو ایمرجنسی کیلئے کچھ نہ ہو تو انگلیاں جل کر تباہ ہو گئیں۔ قمیض کی جگہ بغیر آستینوں کی شمیز کافی ہے۔ لباس کا جھنجٹ تو ملک کے مرد ہی کرتے ہیں۔ ہمارے مرد کوٹ پتلون۔ قمیض۔ موزا۔ جوتا۔ ٹائی۔ غرض یہ کہ تمام تر لباس سے مُزیّن ہوتے ہیں۔ اور ہمارا تو کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ یہ چولی اور ہوٹ پینٹ (hotpant) کا بھی کچھ ہی دن کا ساتھ ہے۔ ویسے بھی مردوں کو ہر کام میں مہارت ہے۔ سلائی بہترین کرتے ہیں۔ بے دھڑک انچ ٹیپ لیکر ہماری کمروں اور سینوں سے لپٹ جاتے ہیں کہ درست فٹنگ ہو۔ اوپر سے اعشاری نظام رائج ہو گیا ہے کہ دو تین مرتبہ جسم کے ضروری حصّوں کا نام بڑی توجہ سے لینا پڑتا ہے۔

میں کہتی ہوں دادی کیا ہم ہی رہ گئے تھے تھیلوں جیسے کپڑے پہننے کیلئے۔ جب کانونٹ سے آتی تھی تو کھٹ سے شلوار پہننے کو کہا جاتا۔ اور فراک کے اوپر چنی کے نام سے دو گز کپڑا لینا پڑتا تو پھر کہیں جا کر باوجود آپکی ہمشکل اور عزیز ترین پوتی ہونے کی وجہ سے زردہ یا بادام پستہ ملتا۔ اور دادا مرحوم ایک پہاڑی جیسے گاؤ تکیے سے لگے ہوئے۔ حقہ ہٹا کر پہلے تو علامہ اقبال کا ایک شعر پڑھتے تھے جو کہ اسوقت یاد نہیں لیکن اس کے اختتام کے لفظ یوں ہیں:

یہ مسلماں ہیں جنھیں دیکھ کے شرمائیں یہود

اور اگر ابا یا اماں کہیں آس پاس باغ میں ہوں تو زیادہ ہی ترنم سے پڑھتے۔ ساتھ دادی آپ میرے چہرے کو بغور دیکھ کر کہتیں، ہرایرے غیرے نتھو خیرے کی نظر پڑتی ہے۔ غیر مرد کی نگاہ لگنے سے بچی کے تل اور مہاسے نکل آئے ہیں۔ تِل تو تھے ہی میری جلد دھوپ کا جلد اثر لیتی تھی لیکن مہاسے عمر اور غلط قسم کے کھانوں سے نکلتے تھے۔

اور یہ کیا آپ میرا حشر کروانے پر تلی رہتی تھیں، کبھی ریٹھے کبھی بیسن اور کبھی چمیلی کی کھلی۔ وہ بھی بال دھو کر ایسی جگہ بیٹھنے کی ہدایت ہوتی، جہاں کسی جن پری کا گزر نہ ہو اور دھلوانے کے بعد کس کے دو موٹی موٹی چوٹیاں کر دی جاتیں۔ دودھ کی بالائی اور لیموں کا رس ملا کر چہرے پر ملواتیں۔ یہ حالت تھی دادی آئینہ دیکھنے کی اجازت نہ تھی کہ کنواری بچیاں ایسا گناہ نہیں کرتیں۔ بلکہ آپ کا پُرانا آئینہ جس کے دو کواڑ ہیں جو کہ اچٹتے اچٹتے دیکھنے پر آپ کیسے بھیانک قصّے سناتیں۔ جوتی تو آپ گرگابی پہنتیں اور ہر موسم میں آپکے پاؤں پھول کی طرح صاف اور نرم گداز ہوتے۔ آجکل ہم لوگ ننگے پاؤں پھرنا پسند کرتے ہیں۔ یا ذرا ٹکڑیوں کے بنے ہوئے سینڈل جو کہ ہمارے پیروں کو ہر قسم کی نجاست سے آشنا کرتے ہیں۔

میں تو کہتی ہوں دادی ایک روز جنّت میں ہنگامہ کر کے اللہ میاں سے چند روز کی سرسری رخصت لے کر آئیں تو سہی تو آپ کے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے اور آپ کا دماغ ٹھکانے لگ جائے گا۔ واپس جا کر آپ اماں کو گلے لگالیں گی۔

آپ کو صرف ایک شہر کی دِید کافی ہوگی۔ یعنی کراچی۔ یہ پھر کچھ غنیمت ہے کہ خلقت بہت زیادہ ہے اور سب کچھ کھپ جاتا ہے۔ لاہور پشاور کوئٹہ پنڈی میں تو زیادہ فیشن کا ہیجان اور خودنمائی کی افراتفری ہے۔ کراچی سے چھوٹے شہر ہیں اس لیے معلوم بھی جلد ہو جاتے ہیں۔

اور یہ جو آپ نے بالوں میں تیل ڈالنے اور ہر دوسرے تیسرے مہینے مہندی لگانے کی عادت ڈلوائی تھی بیکار ثابت ہوئی۔ اب تو بال بنانے کی درجنوں دکانیں ہیں۔ بہت ناز و ادا سے عورتوں کے بال دھلاتے سکھاتے اور رنگتے بھی ہیں۔ دراصل یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مرد ہر فن مولا ہیں۔ عورتیں بھی بال بنانے اور تراشنے کی دکانیں کھولے بیٹھی ہیں۔ لیکن ایک دو غیر ملکی بانکے بھی ہیں جو بال بنانے داد دینے اور آئینہ درست زاویئے سے دکھانے کے ماہر ہوتے ہیں اور غیر عورتوں کے بال بہت سلجھا کر دنیا بھر کے شیمپو سے دھوتے سکھاتے ہیں۔

اور دادی یہ کہہ کر آپ نے رات کی نیند حرام کر دی تھی کہ جو کوئی غلط کام اپنی آنکھ سے دیکھے تو مرتے وقت اس کی شکل نیلی پیلی ہو جاتی ہے۔ یہ تو اب پتا چلا کہ حُسن کے راز کا یہ انوکھا

نقش آپ نے محض ہم کو جہالت میں رکھنے کے لئے ہم سے چھپایا۔ خیر آپکو اگر آجکل آنے کا اتفاق ہو تو پھر دیکھیے۔ سولہ سنگھار کئے ہوئے۔ عینک کی صورت میں پر چوں جتنے بڑے توے ناک پر بٹھائے ہوئے لڑکیاں ۔۔۔ بازاروں۔ سمندروں۔ ہوٹلوں۔ سڑکوں میں۔

اور دادی یہ نہ سمجھنا یہ معمولی سنگھار ہے۔ منہ پر کاشغری سفیدہ رگڑ لیا۔ سرمے کی دو سلائیاں پھیریں۔ اور اخروٹ کا دنداسہ کر کے ایک پھاہا روئی عطر کا کان کے پیچھے لگا دیا۔ بہت ہوا تو سیڑھی مانگ نکال کر کنگھی سے دو ایک طوطے چڑیاں کنپٹیوں کے ساتھ ساتھ کھینچ لئے۔ دادی اب تو درجنوں قسم کے غازے کریمیں اور ایسی ایسی چیزوں جنکا نام بھی بمشکل لینا آئے۔ سنگار اب ایسا ہوتا ہے گویا ایک بنگلے میں روغن ہو۔ پہلے لپائی پتائی چونا سفیدی۔ پھر رنگ در روغن۔ پھر تہہ تہہ پاؤڈر robbialac کا وغیرہ۔

مبالغہ نہیں ہے دادی میں جب اپنے ہم عصروں یا جوان لڑکیوں کو سنگھار کرتے دیکھتی ہوں تو میرے لئے یہ بذاتِ خود ایک تفریح ہوتی ہے۔ چہرہ طرح طرح کے رنگ روپ اختیار کرتا ہے۔ ایک میک اپ اب دھواں دار بھی ہوتا ہے وہ ملنے سے تاثر ہوتا ہے کہ ابھی ابھی جلتی ہوئی بلڈنگ سے چھلانگ لگائی ہو۔ سنا ہے اسکا کچھ اپنا ہی روپ ہے۔ یہی لگتا ہے چہرے پہ دھواں لگ گیا ہے۔ ہونٹوں پر سرخی کی جگہ ایک کافوری سفیدی لگائی جاتی ہے۔ پھر ایک سنگھار ہے۔ وہ جس سے مارے فرحت یا شرم کے ایک سرخی چہرے پہ دوڑ جاتی ہے۔ اس کو بلش آن کہتے ہیں۔ اس کا تاثر پیدا کرنے کو سارا چہرہ گلنار کر دیا جاتا ہے۔ مجھ جیسی بڈھی کھوسٹ بھی لگائے پھرتی ہے۔ آنکھوں کا خیر پوچھنا کیا۔ ہر ایک کی لمبی لمبی مصنوعی پلکیں ہیں جو آنکھوں میں چپکائی جاتی ہیں اور اوپر رنگ برنگ کا آئی شیڈو فیروزی جامنی نیلا رنگ مل دیا۔ پھر کالی پینسل سے لے کر لمبی لکیریں آنکھ کے گرد کھینچ دیں۔ میرے فاسد خیالات میں ان خواتین کو دیکھ کر وہ گائے بھینسیں یاد آ جاتی ہیں جو منڈی کو لے کر جانے سے پہلے تیار کی جاتی ہیں۔

یہ سنگھار تو آپ نے دنیا سے اپنے آخری سفر میں کیوں کیا؟ جبکہ یہ تو ایک جدید اور mod قسم کا سنگھار ہے۔ آپ نے غضب کیا، جاتے جاتے اتنا نہ کہا بیٹی زندگی میں یہ سنگھار کرنا۔

ہونٹوں پہ سفیدی اور آنکھوں پہ سبزی مائل نیلگوں سائے یا آئی شیڈ وتھا۔ آپ کا چہرہ کافور کی سفیدی اور موت کے سکون یا اپنے بیٹے کو ملنے کے اشتیاق میں بہت حسین لگ رہا تھا۔

تو دادی میرے خیال میں آپ کو حالاتِ حاضرہ سے روشناس کرنے کیلئے اتنا ہی کافی ہے۔ زندگی نے ساتھ دیا تو آئندہ بھی آپ کو اسی نوعیت کے محبت نامے ارسال کرتی رہوں گی اور کچھ بعید نہیں کہ آپ کو آکر یہ بہت کچھ زبانی ہی سنا دوں۔ داداجان اور والدین کو میری جانب سے سلام۔

آپکی لاڈلی پوتی۔ نیّر عرف رابعہ

◆◆◆

کچھ ادیبہ۔ نیّر آغا کے بارے میں

نیّر آغا ۱۹۲۸ء میں لاہور میں پیدا ہوئیں اور پندرہ سال کی عمر تک اپنے والدین کے ساتھ کشمیر کی حسین وادیوں میں رہیں۔ ان کی ابتدائی تعلیم پریزنٹیشن کانونٹ Presentation Convent راولپنڈی اور بارہ مولا میں ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے لیڈی ارون کالج دہلی میں دو سال گزارے۔ شادی سے پہلے انہوں نے لاہور میں منشی فاضل کا امتحان بھی پاس کیا۔

سترہ سال کی عمر میں انکی شادی ۱۹۴۵ء میں خان بہادر آغا میر حسین شاہ کے صاحبزادے آغا اصغر علی شاہ سے سرانجام پائی جو اسوقت برطانوی ہندوستانی فوج میں کپتان تھے اور بطور کرنل ۱۹۷۱ء میں ریٹائر ہوئے۔ اپنے شوہر کے ساتھ وہ ہندوستان اور بعد میں پاکستان کے دور دراز مقامات پر رہیں اور دورے کئے۔ فارسی اردو انگریزی اور پنجابی زبانوں پر مکمل عبور تھا لیکن اس کے علاوہ ان کو چترالی براہوی اور سندھی زبانوں میں بھی دلچسپی تھی اور روانی سے بولتی تھیں۔ ان کے مضمون اور سفرنامے پاکستان کے انگریزی رسالوں اور اخباروں میں ۱۹۵۰ء سے لے کر ۱۹۸۰ء تک چھپتے رہے۔ کافرستان اور فوجی زندگی کے بارے میں ان کے ہفتہ وار انگریزی مضامین اخبارات ڈان اور مارننگ نیوز میں چھپے اور بہت مقبول ہوئے۔

اپنی مرحومہ دادی کو مخاطب کر کے یہ دلچسپ خط نیّر آغا کے سحر انگیز اندازِ بیان اور مزاح کا ایک اچھوتا نمونہ ہے۔ اس مختصر سے خاکے میں ان کے دادا دادی اور والدین کے کرداروں کا ایک نوعمر بچی کے اوپر گہرا تاثر ہلکے پھلکے انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ کراچی کے جدید فیشن اور میک اپ کے رجحانات کا جائزہ اور اس پہ دادی کے فرضی ردِعمل میں ان کی تحریر کی روانی اور زبان پر عبور اس تحریر کا نمایاں حصہ ہے۔